Korean Short Stories

A Sketch of the Fading Sun

ڈوبتے سورج کی تصویر

کوریا کے شاہکار افسانے

وان سوہ پارک

انگریزی ترجمہ: ہیون جاے ای سیلی — اردو ترجمہ: مسعود اشعر

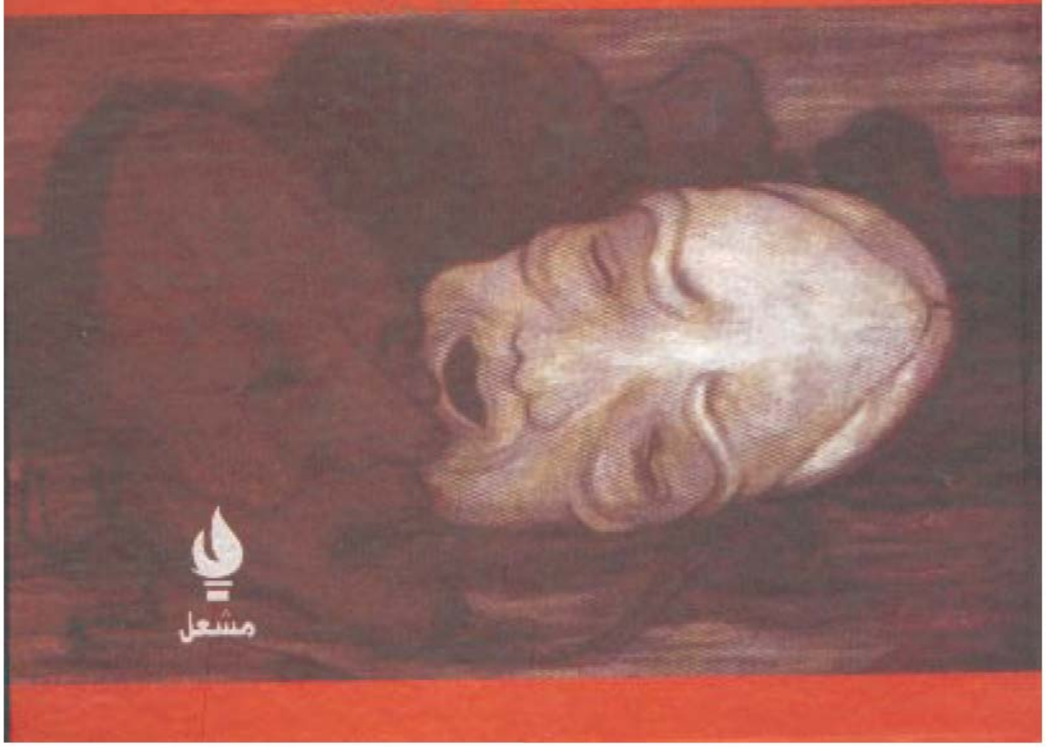

مشعل

ڈوبتے سورج کی تصویر

مصنف

وان۔سوہ پارک

انگریزی ترجمہ: ہیون۔جائے سیلی

اردو ترجمہ: مسعود اشعر

ڈوبتے سورج کی تصویر

نام کتاب : ڈوبتے سورج کی تصور
مصنف :
کمپوزنگ :
مطبع :
تعداد :
صفحات :

MashalBooks.com

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
1	عورت کا نیا جنم	4
2	مصنف	9
2	خزاں کے تین دن	10
3	غربت جو چوری کر لی گئی	64
4	ڈوبتے سورج کی تصویر	86
5	ماما کی بازی(حصہ اول)	111
6	ماما کی بازی (دوسرا حصہ)	165
7	ماما کی بازی (تیسرا حصہ)	218

پیش لفظ

عورت کا نیا جنم

کہا تو یہی جاتا ہے کہ عورت اور مرد کے رشتے کی داستان بہت پرانی ہو چکی ہے۔ لیکن آج بھی جو ادب تخلیق کیا جا رہا ہے اس کا بڑا حصہ عورت مرد کے رشتوں کے بارے میں ہی ہوتا ہے۔ لیکن ایسا بہت کم لکھا گیا ہے جس میں عورت مرد کے تعلقات میں موجود جبر کے عنصر کو اجاگر کیا گیا ہو۔ جیسے ان افسانوں کی مصنفہ وان۔ سوہ پارک نے اپنی تحریر ''جیتے جی نئے دن کا آغاز'' میں لکھا ہے کہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ بیشتر وہ تحریریں جنہیں ادبی تخلیق کہا جاتا ہے دو صنفوں کے جابرانہ رشتوں میں ہی خوبصورتی تلاش کرتی نظر آتی ہیں۔

پارک کا خیال ہے کہ عورت مرد کے رشتے میں صرف جبر کرنے والا ہی نہیں بلکہ جس پر جبر کیا جا رہا ہے وہ بھی اسے مروجہ اخلاق و آداب کے خوبصورت نقاب کے پیچھے چھپانے کی کوشش کرتی ہے۔ اور پھر یہ نقاب ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا رہتا ہے، حتی کہ وہ عورت کے گوشت پوست کا حصہ بن جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ آخر یہ نقاب عورت کا خون بہائے بغیر اتار کر پھینکا بھی نہیں جا سکتا۔ مرد کی جابرانہ فطرت کی جو تصویر کشی ادب میں کی جاتی ہے پارک اس کے تصور سے ہی لرز جاتی ہیں۔ وہ اس کے لیے ایک بہت ہی بے رحم فقرہ ''خون بہانا'' استعمال کرتی ہیں۔ ان کا مطلب یہ ہوا کہ اس جابرانہ رشتے کی گتھی کو'' ایک دوسرے کے درمیان افہام و تفہیم اور سمجھوتے سے نہیں سلجھایا جا سکتا۔

MashalBooks.com

وہ لکھنے والے جو یہ دعوی کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے آپ کو بنی نوع انسان کی آزادی کے لیے وقف کر رکھا ہے' وہ اکثر و بیشتر عورتوں کے مسائل کو ثانوی اہمیت دیتے ہیں۔ اس کی وجہ ان کی لاعلمی ہے' جس کی بنیاد اس غلط فہمی پر ہے کہ عورتوں کے مسائل بنی نوع انسان یا معاشرے کی مجموعی صورت حال سے مختلف نہیں ہیں۔ وہ لکھنے والے جنھوں نے عورتوں کے بارے میں سطحی طور پر لکھ کر کاروباری کامیابی حاصل کی ہے' عورتوں کی زندگی ایسے پیش کرتے ہیں جیسے وہ دوسرے انسانوں کی طرح ہی ہیں اور فرض کر لیتے ہیں کہ عورت اور مرد کا فرق قدرتی ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ یہ لکھنے والے عورتوں کے حقوق کی آواز بلند کرنے والوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ ظلم و جبر کی باتیں کرنا بند کر دیں حالانکہ عورتوں کے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے والے یہ کہتے ہیں کہ معاشرہ عورتوں کو انسان نہیں بلکہ صرف ''عورت'' سمجھتا ہے۔

پارک مسلسل ان اسباب پر نکتہ چینی کرتی ہیں جن کی بنا پر معاشرہ عورت کی گردن میں طوق ڈالتا ہے۔ دنیا بدل رہی ہے لیکن ہمارے رویوں میں کوئی فرق نہیں پڑا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ یہ پدرسری ذہنیت ہے جو معاشرے پر چھائی ہوئی ہے۔

گذشتہ تیس سال میں کوریا نے صنعتی اور تجارتی میدان میں جو ترقی کی ہے اس نے مجبور کر دیا ہے کہ عورتوں کو بھی صنعتی اور تجارتی کارکنوں کی صف میں شامل کیا جائے۔ چنانچہ ان شعبوں میں عورت کی شمولیت اس طرح ہوئی ہے جیسے یہ ایک قدرتی عمل ہو۔ 1980 کی دہائی میں یہ عمل تیز ہوا تو عورت کے ساتھ صنفی امتیاز کا قانونی نظام بظاہر کالعدم ہوگیا۔ لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو صنفی امتیاز میں بہت کم فرق پڑا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کی تیز رفتار ترقی کے ساتھ جو استبدادی سیاسی کلچر پیدا ہوا ہے اس نے ایک شائستہ انسان کی حیثیت سے زندگی کے معنی تلاش کرنے کی اہمیت اور بھی بڑھا دی ہے۔ یہ کلچر ایک نیا ماڈل پیش کرنے میں ناکام ہوگیا ہے۔ چنانچہ کوریا کے ادب میں جو زندگی پیش کی جاتی ہے ہمارے ذہنوں پر اس کی حکم رانی ہے۔ وہ ہمیں اپنی زندگی کی نئی تشکیل کے لیے موقع ہی فراہم نہیں کرتا۔ اس سرزمین پر جہاں استبداد اور مادیت کی حکم رانی ہو وہاں کوئی انسان صحیح معنی میں شائستہ زندگی کا لطف کیسے اٹھا سکتا ہے۔ اسی طرح اس ماحول میں ایک عورت کی حیثیت سے زندہ رہنا اور بھی مشکل ہے۔ مرد کی غیر انسانی زندگی برقرار رکھنے کے لیے عورت کی غیر انسانی زندگی پر

اور بھی بوجھ پڑ جاتا ہے۔ کیا ہمارا پدرسری نظام عورت سے ہر وقت یہ تقاضہ نہیں کرتا کہ ''مرد کی دیکھ بھال کرو'' اور اسے خوش رکھو۔

اس بدلی ہوئی دنیا میں تعلیمی اور مالی اعتبار سے عورت کی سطح خواہ کتنی ہی بلند ہوگئی ہو لیکن عورت کی جذباتی آزادی پر اب بھی پابندی ہے۔ عورت اور مرد کے تعلقات کی نابرابری فطری اور قدرتی بات سمجھ لی گئی ہے اور پورا معاشرہ اسی کی بنیاد پر چلتا ہے۔ اسی لیے جو بھی اس نابرابری کو چیلنج کرتا ہے وہ سزا سے نہیں بچ سکتا۔ چونکہ انسان کا ارتقاء معاشرہ کے پابند اقداری نظام کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کا عمل ہے' اس لیے عورت کی نشو و نما کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے اوپر پابندیاں لگائے۔ یہ صورت اپنے اندر ہی تضاد رکھتی ہے کہ عورت کی نشو و نما اس وقت ہوتی ہے جب وہ انسان کی حیثیت سے نشو و نما پانے سے انکار کر دیتی ہے۔

بہر حال عورتوں کی مزاحمت کی تحریک بھی اتنے ہی شد و مد سے جاری ہے جس شدت سے پدرسری نظام اور اسی کی تاریخ۔ لیکن چونکہ ان کی مزاحمت منظم نہیں تھی بلکہ انفرادی پیمانے پر تھی اسی لیے وہ مروجہ کلچر کے لیے چیلنج نہ بن سکی۔ ادب میں وقتاً فوقتاً اس کا اظہار ہوتا رہا لیکن یہ ذاتی غصے اور انفرادی طیش سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ادیب مجموعی طور پر اتنے پختہ کار نہیں ہیں کہ وہ ہمارے دیوہیکل اور پیچیدہ ثقافتی ڈھانچے کے اندر داخل ہوسکیں اور اس پدرسری نظام کو دریافت کر سکیں جو اس کے بالائی ڈھانچے کو سیراب کرتا ہے۔

حال ہی میں عورتوں نے اپنے مسائل کو سمجھنا شروع کیا ہے اور یہ مسائل حل کرنے کے لیے وہ متحد ہو کر صحیح راستے پر چل نکلی ہیں۔ 1970 کی دہائی کے آخر میں یہ تحریک ابھر کر سامنے آئی۔ اس کا مقصد عورتوں کو بنیادی انسانی حقوق دلانا، معاشرے کو جمہوری بنانا اور اس پدرسری نظام کو مسترد کرنا تھا جو انسانی فطرت کو کچل دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس تحریک نے اپنے آپ کو اس روایتی تحریک سے بالکل ہی الگ کر لیا جو صرف عورتوں کے حالات بہتر بنانے کے لیے چلائی جاتی تھی۔ یہ تحریک کامل مساوات اور برابری چاہتی ہے۔

اسی موقع پر وان۔ سوہ پارک کی تخلیقات سامنے آئیں جو متوسط طبقے کی ان اعلی تعلیم یافتہ گھریلو خواتین کی زندگی پیش کرتی ہیں جو عورتوں کی آزادی کے نقطۂ نظر سے اپنے مسائل حل کر رہی ہیں۔ جب ہم کوریائی خواتین کی تحریک کے حوالے سے ان تخلیقات کو دیکھتے ہیں تو یہ سوال

MashalBooks.com

دماغ میں آتا ہے کہ تاریخی طور پر ان کے معانی کیا ہیں؟ پارک کا کوئی بھی کردار آزادی نسواں کی تحریک میں حصہ لیتا نظر نہیں آتا۔ خود پارک کو بھی ایسا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ انہوں نے اپنے آپ کو کبھی فیمنسٹ ادیب نہیں سمجھا۔ اس لیے انہوں نے دانستہ طور پر کبھی ایسا افسانہ نہیں لکھا جو تانیثی ادب کے زمرے میں آتا ہو۔

پارک کی تخلیقات معاشرے کے ان بنے بنائے خیالات سے گریز کرتی ہیں جن میں عورت مرد کے تعلقات فرماں برداری کی روایات پر مبنی ہوتے ہیں۔ اگر گھر ایک آشیانہ ہے تو ان عورتوں کے خیال میں خاندان کے اندر ہم آہنگی ہونا چاہیے، قطع نظر اس بات کے کہ عورت اور مرد کس قسم کے تعلقات اپنے لیے اطمینان بخش پاتے ہیں۔

البتہ پارک کی تخلیقات میں ہر شوہر اپنی بیوی کو ملکیت ہی سمجھتا ہے اور اس کی جذباتی آزادی کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ وہ بیوی کی معاشی اہلیت حتیٰ کہ اس کے وقت کو بھی اپنی ملکیت ہی گردانتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر وہ مقررہ وقت پر گھر نہیں پہنچتا تو تاخیر سے آنے پر وہ معافی مانگنا ضروری نہیں سمجھتا۔

ان کے ایک افسانے کی ہیروئن کہتی ہے کہ شادی ذلیل کرنے والا رشتہ ہے کیونکہ عورت اپنا سب کچھ دے دیتی ہے اور اسے جو ملتا ہے وہ صرف ایک فیصد ہی ہوتا ہے۔

چونکہ اس رشتے میں ہم آہنگی نہیں ہوتی اس لیے شروع سے ہی مرد ڈرتا رہا ہے کہ کہیں عورت بغاوت نہ کردے چنانچہ وہ طاقت کے ذریعہ عورت پر قابو رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے وہ ''مردانگی'' کہتا ہے یہ عقیدہ کہ عورت اور مرد کے درمیان برابری ہو ہی نہیں سکتی مرد کو طاقت استعمال کرنے کا جواز فراہم کرتا ہے۔ اور یہ عقیدہ نسل در نسل چلا آرہا ہے۔

شوہر اور بیوی کے درمیان اختیارات کی جنگ میں کون جیتتا ہے؟ اس میں پارک پدرسری نظام کی حقیقی طاقت کو ہی پیش کرتی ہیں جو بیوی کی معاشی آزادی کے باوجود برقرار رہتی ہے۔ سرمایہ داری نظام میں جہاں سرمایہ ہی اصل طاقت ہوتا ہے یہ لائق اور قابل عورتیں اپنے اپنے گھروں میں پوری طرح مالی معاونت کرتی ہیں۔ لیکن اپنی اس معاشی طاقت کی وجہ سے بھی یہ عورتیں دبی کچلی رہتی ہیں۔ پارک ہمیں بتاتی ہیں کہ پدرسری نظام کتنی چالاکی سے اپنی حاکمیت قائم رکھتا ہے۔

معاشی ضرورت کی وجہ سے بیوی کے لیے کام کرنا ضروری ہے۔ بلکہ بیوی کی اس مالی مدد کو اچھا سمجھا جاتا ہے۔ اپنے شوہر کی مدد کے لیے گھر سے باہر کام کرنا ایک ایسا عمل ہے جس کی

تعریف کی جاتی ہے۔ البتہ اگر عورت اس لیے گھر سے باہر کام کرتی ہے کہ وہ اپنی ذات کو فائدہ پہنچائے اور اپنی ذاتی حیثیت بہتر بنائے تو اس پر ناک بھوں چڑھائی جاتی ہے کیونکہ اسے مرد کا مقابلہ کرنے کے مترادف مانا جاتا ہے۔ اصول یہ ہے کہ عورت کو اپنی حد سے باہر نہیں جانا چاہیے۔ اس کے کام کرنے کا واحد مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے شوہر کی مدد کررہی ہے۔ پارک کی تخلیقات میں جو متوسط طبقے کی عورتیں پیش کی جاتی ہیں وہ اسی نظریئے کے تابع ہوتی ہیں۔

بہر حال یہ سوچنا غلط ہوگا کہ مرد عورت کی اس صلاحیت کو نہیں مانتا کہ وہ روپیہ کما سکتی ہے۔ وہ اس حقیقت کو مانتا ہے اور وہ دولت کی اہمیت بھی تسلیم کرتا ہے۔ اپنے بعض افسانوں میں پارک شوہر کو اس طرح پیش کرتی ہیں کہ وہ شخص سرمایہ داری نظام کی پیداوار بھی ہے اور اس نظام کا قیدی بھی۔ وہ تقریباً مایوسی کے ساتھ' اس پدرسری نظام کی تصویر کشی کرتی ہیں جس کی جڑیں ہماری زندگی میں بہت گہری ہیں اور جو ہر شعبے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اب جہاں تک عورتوں کے مسائل کے حل کا تعلق ہے (جس میں عورتوں کی آزادی بھی شامل ہے) تو وہاں وہ شدید مایوسی کا شکار نظر آتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں جہاں طلاق کی نوبت آجاتی ہے وہاں وہ ایک نہایت اہم سوال ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں۔ کیا عورتوں کے مسائل حل کرنے کے لیے واقعی طلاق ہی پہلا قدم ہے؟۔

البتہ پارک کی کامیابی یہ ہے کہ انہوں نے مظلوم عورتوں کے بارے میں لکھا ہے اور وہ عورتوں پر ہونے والے جبر کی گہرائیوں تک پہنچ گئی ہیں۔ صرف یہی حقیقت ہے جو عورتوں کو آزادی کا راستہ دکھاتی ہے۔ عام افسانوی عورتوں کے برعکس پارک کے افسانوں کی عورتیں کمزور اور بے سہارا نہیں ہیں کہ وہ اپنی بدنصیبی سے چھٹکارا نہیں پاسکتیں۔ وہ اپنے وقت کی خود مالک ہیں اور مردانہ معاشرے میں بیگانہ رہ کر بھی اپنی مرضی کی زندگی گذارتی ہیں۔ چنانچہ پارک عورتوں کی آزادی کی راہ اس طرح دکھاتی ہیں کہ ان کے نسوانی کردار اپنے موجود ہونے کا اعلان کرتے ہیں کہ ''یہ میں ہوں۔'' اس طرح وہ آزادی نسواں کی تحریک کی حمایت کرتی نظر آتی ہیں۔

ہے رین۔ پارک
پروفیسر مطالعہ نسواں
ایوہاویمن یونیورسٹی
سیول۔ کوریا

MashalBooks.com

مصنف

وان۔سوہ پارک 1931 میں صوبہ کیونگی دو کے گاؤں گائیونگ کن میں پیدا ہوئیں۔ان کی ابتدائی زندگی دیہات میں گذری۔کوریا کی جنگ تک وہ سیول نیشنل یونیورسٹی میں پڑھتی رہیں۔

1970 میں ان کے ناول ''ننگا درخت'' کو روزنامہ دونگ آہ کا ادبی انعام ملا۔انہوں نے متعدد ناول افسانے مضامین اور بچوں کی کہانیاں لکھی ہیں۔

1980 میں ان کے ناول ''خزاں کے تین دن'' پر کوریا کا اعلیٰ پایہ کا ادبی انعام ملا۔ 1981 میں انہیں ری سنگ ادبی انعام سے نوازا گیا۔ یہ انعام حاصل کرنے والی وہ پانچویں ادیب تھیں۔کوریا کی حکومت کی طرف سے انہوں نے تمام یورپی ملکوں کے علاوہ امریکہ اور ہندوستان کا دورہ بھی کیا ہے۔

1990 میں ایک بار پھر کوریا کا عوامی ادبی انعام حاصل کیا۔ یہ انعام کوریا کی کلچر اینڈ آرٹس فاؤنڈیشن کی طرف سے دیا جاتا ہے۔جس کتاب پر یہ انعام ملا وہ ہے۔''ناقابل فراموش''۔

مس پارک آج کل سیول میں رہتی ہیں اور دنیا بھر میں لیکچر کے لیے جاتی رہتی ہیں۔

انگریزی ترجمہ:

ان افسانوں کا انگریزی ترجمہ ہیون جائے ای سیلی نے کیا ہے۔انہیں کلچر اینڈ آرٹس فاؤنڈیشن کی طرف سے بہتریں ترجمہ کا انعام مل چکا ہے۔ان کے ترجمے امریکہ' کینیڈا' انگلستان' آسٹریلیا اور کوریا میں بہت مقبول ہیں ان کا ترجمہ کارنیل یونیورسٹی پریس نے بھی چھاپا ہے۔ انہیں 1995 میں ڈیسن فاؤنڈیشن اور 1999 میں KCAF کی طرف سے گرانٹ دی گئی۔

مس سیلی آج کل اور لینڈو' فلوریڈا میں وائٹ ڈزنی ورلڈ میں کام کرتی ہیں۔

خزاں کے تین دن

1 تین دن پہلے

صرف تین دن رہ گئے ہیں۔

کھڑکی سے خزاں کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ ہر روز سورج زیادہ شدت اور زیادہ حدت کے ساتھ جنوبی کھڑکی سے جھانکتا ہے۔کھڑکی کے پاس رکھی ہوئی مخمل منڈھی کرسی' جو کبھی خوبصورت سبز رنگ کی ہوگی' گھستے گھستے ہلکے خاکستری رنگ کی ہو چکی ہے۔بعض جگہ پر' جہاں زیادہ برش مارا گیا ہے' وہاں اس کا کپڑا سرسوں کی طرح پیلا ہو گیا ہے۔کرسی کسی کام کی نہیں ہے۔سالہا سال سے یہ کرسی اسی جگہ اور اس طرح پڑی ہے اور چونکہ اس پر دھوپ پڑتی رہتی ہے اس لیے اس کا رنگ بدلتا رہتا ہے۔شروع سے ہی یہ اسی طرح چھوڑ دی گئی ہے۔اس کا کوئی مصرف ہی نہیں ہے۔

1953 کے موسم بہار میں جب ابھی کوریا کی جنگ چل رہی تھی تو جنگ بندی کی افواہ سے سیول کی زندگی میں کچھ ہلچل سی پیدا ہو گئی تھی۔اگرچہ روز بروز سیول کی آبادی بڑھتی جا رہی تھی' پھر بھی دارالحکومت یہاں منتقل نہیں ہوا تھا۔میں ستائیس سال کی ہو چکی تھی مگر ابھی تک کنواری تھی۔ اس کے باوجود اس شہر میں اپنا دفتر کھولنے کے لیے نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ اکیلی ہی یہاں آ گئی تھی۔میں نے اچھی جگہ تلاش کرنے کے لیے دن رات ایک کر دیے تھے۔

اپنے کام میں میری مہارت کچھ زیادہ ہی تھی۔البتہ میرے لیے سب سے بڑی رکاوٹ میرا کم عمر لڑکیوں والا چہرہ تھا۔جنگ نے جب ہماری قوم کی آبروریزی کی اس سے بھی پہلے میں خواتین کے میڈیکل کالج سے فارغ ہو چکی تھی۔میں جنگ کے زمانے میں ان زخمی فوجیوں کی

MashalBooks.com

دیکھ بھال کرتی تھی جو میڈیکل کالج سے ملحقہ ہسپتال میں لائے جاتے تھے۔ جنگ کے دوران میں ہی ایک پناہ گزیں کی حیثیت سے میں نے اس لیڈی ڈاکٹر کے ماتحت کام کیا جو کالج میں میری سینئر تھی۔ فوج میں بلائے جانے سے پہلے اس لیڈی ڈاکٹر اور اس کے شوہر کی پریکٹس خوب چلتی تھی۔ شوہر فوج میں چلا گیا تو اس اکیلی ڈاکٹر پر کام کا بوجھ بہت بڑھ گیا اس لیے اس نے مجھے اپنے پاس بلالیا تھا۔ اس وقت تک پروفیشنل ڈاکٹروں کا نظام اتنا سخت نہیں تھا جیسا آج ہے۔ چونکہ مجھے جنگ کے زمانے میں علاج معالجے کا خاصہ تجربہ ہو چکا تھا اس لیے مجھے پورا اعتماد تھا کہ میں اپنا علیحدہ کلینک کھول سکتی ہوں۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں تھی کہ میں کس قسم کے مریضوں کا علاج کروں گی۔ بس مقصد یہ تھا کہ کام شروع کر دوں۔

اس وقت تک دارالحکومت سیول منتقل نہیں ہوا تھا اس لیے شہروں کے وسط میں بھی آسانی سے جگہ مل سکتی تھی۔ لیکن میں نے یہ سوچ کر ان علاقوں کی طرف جانا مناسب نہیں سمجھا کہ دارالحکومت کی واپسی کی خبر سے جائیدادوں کی قیمتیں بڑھ گئی ہوں گی۔ پھر میں نے یہ بھی سوچا کہ شاندار ڈگریوں والے مشہور اسپلشٹ ڈاکٹر انہی علاقوں پر قبضہ کریں گے جو سونے کی کان ہیں۔ میں نے طے کیا کہ ان علاقوں سے دور ہی رہا جائے تو اچھا ہے۔

میں نے سیول کے نواح میں کسی عام سے رہائشی علاقے میں اپنا کلنک کھولنے کا فیصلہ کیا۔ آخر مجھے اپنی پسند کا علاقہ مل گیا۔ اور کیونگ سونگ اسٹور کی دوسری منزل پر ایک جگہ میں نے کرائے پر لے لی۔ تیس سال پہلے یہ علاقہ مشرقی سیول کا سرکاری دروازہ تھا جب آپ ریلوے لائن پار کرتے تو یانگ جو میدان پہنچ جاتے جہاں تیل اور ایندھن کی بدبو آپ کا استقبال کرتی۔

کیونگ سونگ اسٹور پر چینی رسم الخط میں جو بورڈ لگا تھا وہ پرانے زمانے کی یادگار تھا۔ ری پی بادشاہوں کے زمانے میں کیونگ سونگ ہی وہ نام تھا جو دارالحکومت کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس اسٹور پر زرعی آلات فروخت ہوتے تھے۔ اسٹور کے نام کے لغوی معنی تو ''دارالحکومت'' تھے مگر اس کا عام تاثر دیہاتی سا تھا۔ اس اسٹور پر گنوار پن ٹپکتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے اردگرد کا ماحول بھی ایسا ہی تھا۔ اس کے باوجود یانگ ہو سے بیل گاڑیوں اور گھوڑا گاڑیوں پر آنے والے لوگوں کو ایسا ہی لگتا تھا جیسے وہ سیول میں داخل ہو رہے ہوں۔

اس علاقے کے بوڑھے پراپرٹی ڈیلر نے مجھے بتایا کہ کیونگ سونگ اسٹور کی دوسری منزل

خالی ہے۔ وہ مجھے جگہ دکھانے لے گیا۔ وہاں مجھے کیونگ سونگ فوٹو اسٹوڈیو کا بورڈ بھی لگا ہوا نظر آیا۔ اس نے بتایا کہ جس فوٹو گرافر نے یہ جگہ کرائے پر لی تھی وہ جنگ کے زمانے میں لاپتہ ہو گیا تھا۔ اس وقت سے یہ اسٹوڈیو خالی پڑا ہے۔ اسٹوڈیو کی ہر کارآمد چیز چوری ہو گئی ہے اور اب وہاں پڑوس کے آوارہ لڑکے دھما چوکڑی مچاتے رہتے ہیں۔

اسٹور اور رہائش والی جگہ کا درمیانی دروازہ ٹوٹ چکا تھا۔ اور وہ دروازہ فرش پر پڑا ہوا تھا۔ ڈارک روم میں جو سیاہ پردہ پڑا ہوا تھا وہ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ سیڑھیوں کا دروازہ بھی موجود نہیں تھا۔ اور تو اور کوئی کھڑکی بھی سلامت نہیں تھی۔ اسی کاٹھ کباڑ میں مجھے وہ مخمل منڈھی ہوئی کرسی نظر آئی۔ وہ کرسی کسی زنانہ ٹائپ شہزادے کی یاد دلاتی تھی جسے اغوا کر کے کسی طاقت ور ملک میں لا کر بند کر دیا گیا ہو۔ کرسی بہت ہی عجیب وغریب مگر رعب دار معلوم ہوتی تھی۔

بعد میں مجھے احساس ہوا کہ یہ مخملی کرسی کسی بھی مقام یا ماحول کے لیے عیاشی سے کم نہیں ہے۔ بلکہ وہ ہر دیکھنے والے کی نظروں میں چبھتی تھی۔ میرے خیال میں اسے کہیں بھی اس کے لائق جگہ نہیں مل سکتی تھی۔ وہ کرسی کسی کے بیٹھنے اور آرام کرنے کے لیے بنائی ہی نہیں گئی تھی۔ بلکہ وہ تو دوسرے فرنیچر سے ملتی بھی نہیں تھی۔ اس کا واحد مقصد یہ ہوگا کہ وہ فوٹو گرافر کے لیے بیک گراؤنڈ کا کام دیتی ہوگی۔ اگر آپ پرانے انداز کی تصویریں دیکھیں تو ان میں ایک آدمی کرسی پر بیٹھا ہوگا اور دوسرا اس کے ساتھ کھڑا ہوگا۔ اور اگر دو پورٹریٹ ہو تو ایک آدمی کرسی کے ساتھ اس طرح اکڑا ہوا کھڑا ہوگا کہ اس کا ایک ہاتھ کرسی کی پشت پر رکھا ہوگا۔

نوزائیدہ بیٹے کے ایک سو دن پورے ہونے پر جو تقریب منائی جاتی ہے اس موقع پر ننگا بچہ بھی اس کرسی پر بیٹھ کر اپنی تصویر کھینچواتا ہوگا۔ اس موقع کے لیے خاص طور سے یہ کرسی صاف کی جاتی ہوگی۔ کرسی کی پشت بہت اونچی تھی اور اس کے پیچھے لکڑی پر ققنس بنا ہوا تھا۔ دونوں ہتھوں پر مڑا تڑا ادھا کندہ کیا ہوا تھا۔ کرسی بہت ہی نامناسب طور پر پرتعیش نظر آتی تھی۔ خاص طور پر اس اجڑے ہوئے کمرے میں اس نے مجھے حیران کر دیا تھا۔

بوڑھے پراپرٹی ڈیلر نے مجھے خاموش دیکھا تو سمجھا کہ مجھے وہ جگہ پسند ہے۔ اس نے خوشی خوشی وعدہ کیا کہ وہ اس جائیداد کے مالک سے کرائے کی بات کر لے گا اور اس کی مرمت اور آرائش وغیرہ کے لیے بھی اس سے کہے گا کہ وہ سارا خرچہ بھی خود ہی برداشت کرے۔ وہ مجھے

MashalBooks.com

یقین دلا کر نیچے چلا گیا۔ بوڑھا دانگ سٹور کا مالک تھا اور اب بھی مالک ہے۔ میں اکیلی رہ گئی تو میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میری حالت اسی چھوٹی سی لڑکی کی طرح جو تنہائی میں اپنی ماں کے کپڑے پہننا چاہتی ہو۔ اسی کیفیت میں میں مخملی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس وقت بھی وہ کرسی کھڑکی کے پاس رکھی تھی اور اس کا رخ جنوب کی طرف تھا۔

بڑی سڑک کے پار پرانا زراعتی ہائی اسکول تھا جو امریکی فوجیوں کا اڈہ بن چکا تھا۔ اردگرد کا ماحول بھی کافی بدل گیا تھا۔ اب وہاں اونچی اونچی عمارتیں کھڑی تھیں۔ ایک تجرباتی لیبارٹری سامنے میدان میں دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ رہائشی مکان تھے۔ اسکول کے دروازے پر امریکی ملٹری پولیس کا سپاہی پہرہ دے رہا تھا۔

میں اس علاقے میں آئی تو مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا تھا۔ اگرچہ سارا علاقہ گندی بستی کا نظارہ پیش کر رہا تھا لیکن وہاں ترقی کے آثار بھی دکھائی دے رہے تھے۔ پورے شہر پر ہی غربت چھائی ہوئی تھی کسی ایک چیز پر انگلی نہیں رکھی جا سکتی تھی پھر بھی وہاں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس نے مجھے پریشان کر رکھا تھا۔ اور یہ بات غربت سے بھی زیادہ گھناؤنی تھی۔ وہاں کا ماحول چکلے اور کوٹھے والا تھا۔ پھر اچانک مجھے اپنی پریشانی کا سبب بھی معلوم ہو گیا۔ وہاں امریکی فوجی اڈہ تھا۔ میں نے سر جھٹک کر اپنے دماغ سے یہ خیال نکالا اور ایک دم کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے مجھے وہاں بند کر دیا گیا ہو۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب میں کیا کروں۔ میں صرف فرش پر ادھر سے ادھر چہل قدمی ہی کر سکتی تھی۔ میرے پیروں کے نیچے فرش چرخ چوں کر رہا تھا جیسے میں چیخ رہی ہوں۔

نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے فرش پر بکھری ہوئی تصویریں اکٹھی کرنا شروع کر دیں۔ وہاں اسکول کی ایک لڑکی کی تصویر ملی جس کے سر پر چھوٹے چھوٹے بال تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں پر اپنا چہرہ رکھا ہوا تھا وہ بہت ہی سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ ایک سال کے پیارے سے بچے کی سالگرہ کی تصویر بھی وہاں پڑی تھی۔ بوڑھے میاں بیوی کی ایک تصویر بھی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے ذرا فاصلے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا یہ تصویر کھنچوا کر ان کے بچوں نے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا۔ ڈاک کے ٹکٹ کے سائز کی بھی بہت سی تصویریں تھیں۔ یہ تصویریں مختلف اوقات اور مختلف تاریخوں میں کھینچی گئی تھیں مگر ان سب میں ایک چیز مشترک

تھی۔ تمام چہروں پر ایک ہی پتھریلا تاثر تھا۔

ظاہر ہے میں ان میں کسی ایک کو بھی نہیں پہنچانتی تھی۔ لیکن حیرت انگیز طور پر مجھے ان کے ساتھ ایک قربت سی محسوس ہوئی۔ ہم سب کی قسمت ایک ہی جیسی تھی۔ ہم سب نے کوریا کی جنگ میں زندگی بسر کی تھی۔ اس جزیرہ نما کے رہنے والے ہر شخص کا ایک ہی ہولناک تجربہ تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ جن مصائب کا ہم شکار ہوئے ہیں ان میں ہر فرد نے کس طرح اپنے اپنے مقدر کا مقابلہ کیا۔

میں نے ایک بار پھر زور سے سر جھٹکا' جیسے اپنے دماغ کے جالے صاف کرنا چاہتی ہوں۔ اور پھر فرش پر بڑی تصویریں اکٹھی کرنا شروع کر دیں۔ میں نے ایک ننگے مرد اور ننگی عورت کی تصویر اٹھائی' وہ دونوں عجیب سے ٹیڑھے میڑھے انداز میں پڑے ہوئے تھے۔ میں نے جلدی سے اس تصویر کے پرزے پرزے کر دیے۔ تصویر پھاڑتے ہوئے میرے ہاتھ کانپنے لگے تھے۔ میں پیچھے ہٹی اور مخملی کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔ تصویر تو میں نے پھاڑ دی تھی مگر میرے اندر جذبات کا ایک طوفان امنڈ آیا تھا۔ ایک بار پھر میرے دماغ میں وہ ہولناک واقعہ گھوم گیا جس نے میری زندگی بدل دی تھی۔ تیز گھناؤنی بدبو سے پھر میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ جب وہ میرے اوپر آگے پیچھے حرکت کرتا تو اس کے شیشے کی جھاڑو جیسے بال میرے چہرے پر رگڑتے۔ اس نے جب میرے اوپر چڑھائی کی تھی تو اس کے رسی جیسے لمبے اور مضبوط ہاتھوں اور پیروں نے مجھے کچل کر رکھ دیا تھا، میں شدید درد سے کانپ اٹھی تھی۔

آبروریزی کے بعد مجھے ایسے لگا تھا جیسے زندگی کی ہر چیز اپنے معانی کھو چکی ہے۔ میں محرومی اور بے معنویت کے احساس میں غرق ہو گئی تھی۔ ابھی میں اپنے خیالوں میں ہی کھوئی ہوئی تھی کہ بوڑھا پراپرٹی ڈیلر پھر نمودار ہو گیا۔ یہ بڈھا مسکرا کیوں رہا ہے؟ میں تو اپنا ماضی یاد کر رہی تھی۔

''تم بالکل نہ بولنا، خاموش رہنا۔ میں جیسا کہوں ویسا ہی کرنا۔ اوکے؟ ہم یہاں ڈاکٹر کا کلینک کھولیں گے۔ میں کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس سے تمہیں نقصان ہو۔ اوکے؟'' اس نے اپنا منہ میرے کان کے قریب لا کر کہا۔ اس کے منہ سے تمباکو کی بدبو آ رہی تھی۔

وہ بوڑھا ہر جملے کے بعد ''اوکے؟'' کہتا تھا مگر اس کا یہ اوکے کہنا برا نہیں لگتا تھا۔ بلکہ اس کا لہجہ میرے کانوں کو اچھا ہی لگتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اسٹور کا بوڑھا مالک وھانگ بھی وہاں آ گیا۔

MashalBooks.com

پراپرٹی ڈیلر نے کرایہ نامہ اسے دکھایا۔ میں نے اپنا پرس دیا کہ اس پر رکھ کر لکھا پڑھی کرلیں۔ وھانگ نے کرایہ نامہ پڑھا۔ پراپرٹی ڈیلر نے میری طرف داری کی اور اس سے کہا کہ سیکیورٹی کی رقم کم کردے۔ بلکہ اس نے کرایہ بھی کم سے کم رکھنے پر اصرار کیا۔ اور اس کے لیے اس نے اسٹوڈیو کی خستہ حالت کو خوب بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔ دھانگ بظاہر تو بہت ترش مزاج معلوم ہوتا تھا مگر اس نے پراپرٹی ڈیلر کی بات مان لی۔

اس طرح کسی پیچیدگی کی بغیر ہی میرے حق میں معاملہ طے پا گیا۔ دھانگ مان گیا کہ کھڑکیاں اور دروازے ٹھیک کرادے گا۔ بلکہ پارٹیشن بھی لگوادے گا۔ پراپرٹی ڈیلر نے چیونٹی کے سر برابر لفظوں میں کرایہ نامہ کے خالی حصے پر کیے۔ اس کے بعد دھانگ اور میں نے اسے سرسری طور پر پڑھا اور دونوں نے دستخط کردیے۔

کرایہ نامہ پر دستخط ہوگئے اور کمیشن بھی ادا کردیا گیا تو بوڑھے دھانگ نے مجھ سے پوچھا کہ میں کن بیماریوں کا علاج کیا کروں گی۔ ابھی میں جواب بھی نہیں دینے پائی تھی کہ پراپرٹی ڈیلر نے فوراً کہہ دیا۔

''جنرل پریکٹس؟'' آپ نے یہی بتایا تھا نا مادام؟." وہ میری مدد کررہا تھا۔

''نہیں۔ میں گائناکالوجی پریکٹس کروں گی'' میں نے مخملی کرسی سے چھلانگ لگا کر کہا۔ یہ فیصلہ میں نے اچانک نہیں کیا تھا بلکہ ننگی تصویریں دیکھ کر اور اس علاقے میں طوائفوں کے چکلے ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے یہ طے کیا تھا۔ اس اذیت کا اندازہ وہ عورت ہی لگا سکتی ہے جس کے پیٹ میں ان چاہا بچہ ہو۔ کسی اور بیماری کا درد و کرب دوسروں میں ہمدردی کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ لیکن کسی غیر کا بچہ پیٹ میں ہو تو دوسرے لوگ طنز کرتے ہیں یا الزام لگاتے ہیں۔ اگر دوسرے ڈاکٹروں کا یہ خواب ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو بیماریوں سے نجات دلائیں تو میرا خواب یہ تھا کہ عورتوں کو اس کرب سے چھٹکارا دلاؤں جو تمام بیماریوں سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہے۔

''اگر یہاں ان کا کام نہ چلا اور انہیں یہ شہر چھوڑنا پڑ گیا تو میرا خیال ہے کسی جھگڑے سے بچنے کے لیے انہیں تحریری طور پر وعدہ کرنا چاہیے کہ مرمت کے تمام اخراجات یہ خود ادا کریں گی، جیسے یہ تحریر کہ مالک ذمہ دار نہیں ہوگا۔'' بوڑھے وانگ نے کنکھیوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ جب وہ یہ بات کررہا تھا کہ تو اس کے چہرے پر حقارت کے تاثرات تھے۔

''دیکھیے صاحب' آپ انہیں کامیابی کی دعا دینے کے بجائے ایسی بات کیوں کررہے ہیں۔ مادام آپ ناراض نہوں یہ یونہی ایسی باتیں کررہے ہیں' یہ دل کے برے نہیں ہیں۔ آپ سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ اوکے؟ پراپرٹی ڈیلر نے مجھے تسلی دی۔

''انکل' اس شہر کے لوگوں کو آپ خوب جانتے ہیں۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ یہاں کی عورتوں کے لیے بچے جننا عام سی بات ہے۔ آخر کوئی بھی معقول عورت جو ننھے بچوں کی تین دیویوں کو ناراض نہ کرنا چاہتی ہو' وہ بھلا کسی لیڈی ڈاکٹر کے پاس کیوں جائے گی۔ یہ تو بہت گھناؤنی بات ہے'' بوڑھے دھانگ نے کہا۔

''انسان کو سوچ سمجھ کر بات کرنا چاہیے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ آپ ایسی بات کریں؟ میں کہہ چکا ہوں کہ یہ مادام یہاں ماؤں اور بچوں کا علاج کریں گی۔ کیا آپ زرعی آلات کا کاروبار چھوڑ کر کپڑے بیچنا شروع کردیں گے؟۔ کیا کوئی اپنا پیشہ چھوڑ سکتا ہے؟۔ انہوں نے جو پڑھا ہے وہ بیماریوں کا علاج ہے۔ ظاہر ہے یہ صرف عورتوں کا علاج ہی تو نہیں کریں گی۔ اس پر میں شرط لگا سکتا ہوں۔'' پراپرٹی ڈیلر نے زور شور سے کہا۔

اس کے بعد پراپرٹی ڈیلر مالک مکان کو تقریباً گھسیٹتا ہوا نیچے لے گیا۔ گائناکالوجی کے بارے میں ان کی لاعلمی پر مجھے ہنسی آگئی۔

کلنک کھولنے کی تیاریاں زور شور سے شروع ہوگئیں۔ بوڑھے وھانگ نے بڑھئی بلاکر دروازہ اور کھڑکیاں لگوادیں اور پارٹیشن بھی ٹھیک کرادیا۔ میں نے پینٹ کرنے والوں کو بلایا اور اندر باہر سے کلنک پر پینٹ کرالیا۔ سائن بورڈ بنانے والے سے کلنک کے باہر بورڈ لگوادیا۔ ''ایسٹ سائیڈ میڈیکل کلنک''۔ اس کے نیچے میں نے لکھوادیا۔ زچہ اور بچہ کے علاج کی ماہر۔'' ان دنوں سیول میں میز کرسی اور صوفے سستے مل جاتے تھے۔

ہان دریا کے پار آتے جاتے میں نے ضروری طبی آلات بھی خرید لیے۔ یہ چمکتے ہوئے ٹھنڈے ٹھنڈے آلات دیکھے تو میرے دل کو جیسے سکون سا آگیا۔ ایک عجیب سا احساس ہوا جیسے میں اپنی تقدیر سے لڑ رہی ہوں۔

میں نے ایگزامینیشن ٹیبل بھی خریدی جس میں عورتوں کے معائنے کے لیے خاص سہولت موجود ہوتی ہے۔ اکثر لوگوں کے لیے یہ ایگزامینیشن ٹیبل ڈاکٹروں کی سہولت کے لیے ایک عام

MashalBooks.com

سی چیز ہوتی ہے لیکن عورتوں کے لیے یہ ایک ناقابل برداشت مصیبت ہے۔ اس وقت مجھے اپنی اذیت یاد آئی تو میں نے زور سے دانت بھینچ لیے۔

کلنک کھولنے کے لیے ہر کام پورا ہو چکا تھا۔ فوٹو اسٹوڈیو پوری طرح ڈاکٹر کے کلنک میں تبدیل ہو چکا تھا۔ البتہ ابھی ایک چیز باقی تھی جو واقعی آنکھوں کو بری لگ رہی تھی۔ اور وہ تھی مخملی کرسی۔ وھانگ نے صفائی کرائی تو یہ کرسی ایک طرف کردی۔ پھر بڑھئی آیا تو اس نے بھی اسے ایک طرف رکھ دیا۔ کرسی بہرحال دفتر میں ہی رہی۔ اور جب پینٹر نے دیواروں پر رنگ کیا تو اس نے اس کرسی کو کپڑے سے ڈھانپ دیا۔ میں جانتی تھی کہ میرے لیے یہ کرسی بیکار ہے پھر بھی اسے پھینکنے یا کسی کو دینے کو میرا جی نہ چاہا۔ بہرحال میں نے اس کرسی کو نظرانداز کردیا اور اسے جنوبی کھڑکی کے ساتھ اسی جگہ رہنے دیا جہاں پہلے دن میں نے اسے دیکھا تھا۔

بوڑھے وھانگ کی پیش گوئی کے مطابق کلنک کی تمام تیاریاں مکمل ہونے کے بعد بھی کوئی مریض نہیں آیا۔ مگر مجھے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ البتہ ڈاکٹر کے کلنک میں وہ کرسی بے تکی سی نظر آتی تھی۔ اب میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی تھی کہ ابھی میں پریکٹس کے لیے پوری طرح تیار نہیں ہوں۔

ایک دن میں باورچی خانے کے برتن خرید کر واپس ہوئی تو دیکھا کہ کوئی میرا انتظار کر رہا ہے۔ کھڑکی کے ساتھ رکھی ہوئی کرسی پر کوئی بیٹھا تھا۔ مگر وہ کوئی مریض نہیں تھا بلکہ میرے والد تھے وہ کوریا کا روایتی سوتی لبادہ ''ڈرومگی'' اور نکیلے چمک دار جوتے پہنے ہوئے تھے۔ وہ بڑے آرام سے کرسی پر بیٹھے تھے۔ ان کے بیٹھنے سے اچانک وہ کرسی مجھے بہت ہی باوقار نظر آنے لگی۔ اس وقت میں نے اپنے آپ کو شاباش دی کہ وہ کرسی میں نے پھینکی نہیں تھی۔ لیکن مجھے اپنے باپ کو دیکھ کر کچھ خوشی نہیں ہوئی۔

''آپ کو یہ جگہ کیسے ملی؟'' میں نے پوچھا۔

''تم پہلے جس ہسپتال میں کام کرتی تھیں میں وہاں گیا۔ وہاں سے تمہارا پتہ ملا۔''

''آپ فکر نہ کیجیے' میں جہاں بھی رہوں گی ٹھیک ٹھاک ہی رہوں گی۔ آپ کی صحت ٹھیک نہیں ہے۔ خواہ' مخواہ آپ کیوں اس طرح پھر رہے ہیں۔''

سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اپنے باپ کی صحت کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ میں گھر میں سب سے چھوٹی تھی۔ میرا بھائی کہتا رہتا تھا کہ باپ کے مرنے سے پہلے شادی کرلو۔ لوگ یہ

ظاہر کر کے مجھے جرم کا احساس دلاتے تھے کہ ہمارے باپ ہمیشہ زندہ نہیں رہیں گے۔ وہ سمجھاتے تھے کہ باپ کا دل نہ دکھاؤ اور جلدی سے شادی کرلو۔ یہ سن سن کر میرے کان پک گئے تھے۔ اور ان سب کی باتیں سن کر خیال آنے لگا تھا کہ میرے باپ زیادہ دن زندہ نہیں رہیں گے۔ اور چونکہ میں سب سے چھوٹی تھی اور بچپن میں ہی میری ماں کا انتقال ہوگیا تھا اس لیے ڈرتی تھی کہ میں جلدی یتیم ہو جاؤں گی۔ لیکن میرے باپ نے خود کبھی نہیں کہا تھا کہ ان کے مرنے سے پہلے میں شادی کرلوں۔ وہ اپنے بچوں کے معاملات میں بالکل دخل نہیں دیتے تھے۔

''تمہارا کلنک بہت اچھی جگہ پر ہے۔'' انہوں نے میرے کلنک اور اس علاقے کی تعریف کی؟

''یہ تو بہت ہی گندہ علاقہ ہے۔'' میں نے اپنے اندرونی جذبات چھپاتے ہوئے کہا۔

''تم جانتی نہیں' گندے علاقوں میں لوگ زیادہ بیمار ہوتے ہیں۔ اور پھر تم نے جو تعلیم حاصل کی ہے اس سے بہت زیادہ کمائی کرنے کی امید نہ رکھو قدیم زمانے سے ہی طبیب کا کام علاج کرنا رہا ہے۔ کمائی کرنا نہیں۔ یہ دماغ میں رکھو اور پھر اپنا کام کرو۔'' میرے باپ نے کہا۔

میں نے مشکل سے اپنی ہنسی دبائی۔ میرا ماضی اور مستقبل کوئی نہیں جانتا۔ اور یہ بھی کوئی نہیں جانتا کہ میں نے اپنے دل میں کتنے درد چھپا رکھے ہیں۔

وہ جانے لگے تو میں نے کہا ذرا ٹھہر جایئے۔ معلوم نہیں میرے اس کہنے سے انہوں نے کیا سمجھا کہ کہنے لگے' میرے لیے تکلف نہ کرو۔ میرا کچھ بھی کھانے کو جی نہیں چاہ رہا ہے۔ میں نے بھی انہیں نہیں روکا۔ لیکن میں یہ چاہتی تھی کہ جس کرسی پر وہ بیٹھے ہیں وہیں بیٹھے رہیں۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ بچے اپنے ماں باپ کی تصویریں کیوں کھنچوانا چاہتے ہیں۔ اس وقت میں نے ان کی تصویر تو نہیں کھینچی مگر جس طرح وہ اس کرسی پر بیٹھے تھے اس کی تصویر میرے دل پر ہمیشہ کے لیے نقش ہوگئی۔

وہ تھوڑی دیر اسی طرح بیٹھے رہے۔ پھر جھجکتے ہوئے وہ تحفہ مجھے دیا جو وہ میرے لیے لائے تھے۔ چلتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ اب وہ میرے بڑے بھائی کے پاس جائیں گے جو نائیوان میں رہتے ہیں۔ وہ آخری دن تھا جب میں نے اپنے باپ کو دیکھا تھا۔ میرے لیے وہ جو تحفہ لائے تھے وہ بقراط کا وہ حلف تھا جو تعلیم مکمل کرنے کے بعد ڈاکٹر اٹھاتے ہیں۔ میں نے اس وقت تو خاموشی سے وہ حلف نامہ لے لیا مگر بعد میں مجھے ہنسی آگئی۔ ان کے سامنے میں ایسے نہیں ہنس

MashalBooks.com